سلسلہ مطبوعات ۳۱

تاریخ اسلام

(ایک معروضی مطالعہ)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

سلسلہ مطبوعات (31)

تاریخ اسلام

(ایک معروضی مطالعہ)

www.rahimia.org

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

نام پمفلٹ	....	تاریخ اسلام
		(ایک معروضی مطالعہ)
افکار	....	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
سلسلہ مطبوعات نمبر	....	31
سن اشاعت طبع اول	....	ستمبر/ 1994ء
سن اشاعت دوم	....	جون/ 2006ء
سن اشاعت سوم	....	نومبر/ 2021ء
زیرِ اہتمام	....	شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان
قیمت	....	

www.rahimia.org

ملنے کا پتہ:

☆ رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

PH:00-92-42-36307714 , 36369089

برائے خط و کتابت:

☆ پوسٹ بکس نمبر 938، پوسٹ آفس گلگشت، ملتان

حرفِ اوّل

اقوام عالم تاریخ کے مدوجزر پر نظر رکھتی ہیں اور معروضی صورتِ حال کو اپنے داخلی احساسات کے بجائے حقائق کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ اپنے حال اور مستقبل میں بھی درست زاویہ نظر اختیار کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس اپنی ذاتی خواہشات اور شخصی یا گروہی پسند و ناپسند کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ہمیشہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔

تاریخ اسلام کے ساتھ ہمارے مؤرخین کی اکثریت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اس نے تاریخ کو چند شخصیات کی سوانح بنا کر رکھ دیا ہے۔ شخصی خوبیوں سے تاریخ شان دار اور ذاتی خامیوں سے تاریخ داغ دار جانی جانے لگی اور اسی وَجہ سے ہم فکری طور پر معلق ہو کر رہ گئے ہیں کہ ماضی سے تعلق جوڑے بِنا بات بنتی نہیں اور دوسری طرف مبینہ تاریخ قبول کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اس تضاد نے ہمارے افکار کے ارتقائی سفر کو بھی شدید طور پر متأثر کیا ہے۔

تاریخ اسلام میں ابن خلدون پہلی نمایاں شخصیت ہیں، جنھوں نے معروضی اندازِ فکر اپنانے کی ضرورت کو اجاگر کیا، لیکن ان کی تجویز کردہ راہ پر بعد میں آنے والے مؤرخین کم ہی مائل ہوئے۔ برعظیم کی عظیم انقلابی شخصیت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دیگر فکری میدانوں کی طرح تاریخ اسلام کے حساس موضوع کی بابت جس طرح تجزیاتی اندازِ فکر اختیار کیا ہے، اس سے نہ صرف کئی گرہیں کھلتی ہیں بلکہ تاریخ اسلام کے بارے میں احساس کمتری کے بجائے ایک نئی فکری توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے اندازِ فکر پر اپنے رویوں کو استوار کیا جائے اور حالات کی معروضی تعبیر کو بھی مناسب مقام دیا جائے۔

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

چیئرمین: شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

www.rahimia.org

مضامین ایک نظر میں

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	حرفِ اوّل	3
2	تاریخ اسلام ایک معروضی مطالعہ	6
3	قوموں کی زندگی اور اجتماعیت	6
4	قریش کا تاریخی تسلسل	7
5	قرآن اور اجتماعیت	8
6	قریش کی اجتماعی حیثیت	10
7	بنی اسرائیل میں باہم کش مکش	11
8	قریش مکہ کی جدید تنظیم	11
9	قریش کی امتیازی حیثیت	12
10	قرآن کا مخاطب؛ ترقی یافتہ قریش	12
11	دنیا کا مشکل ترین مسئلہ اور اسلام	13
12	رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں	14
13	مکی عہد نبوت	15
14	مدنی دورِ نبوت	17
15	قریش کے تصور قومیت کی اصلاح	17
16	بعثت نبوی ﷺ کی بین الاقوامی حیثیت کی تکمیل	18
17	رد انقلاب کی ناکام کوشش	20
18	قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافت راشدہ	20
19	قریش کی قیادت اور بعثت محمدی ﷺ کا باہم تعلق	21
20	جماعت صحابہ میں اختلاف رائے	22

www.rahimia.org

نمبرشمار	عنوانات	صفحہ نمبر
21	خانہ جنگی کی حقیقت	22
22	انقلابات کی ایک معروضی حقیقت	23
23	پارلیمانی نظام کے لیے امن کی شرط	24
24	غیر معمولی حالات اور انقلابیوں کا کردار	24
25	اسلام ایک انقلابی دین	25
26	عربوں کی قومی حکومت اور بنوامیہ کا عروج	26
27	مؤرخین کی ناانصافی	27
28	نئی انقلابی حکمت عملی	27
29	اموی دور میں بین الاقوامی اسلامی فکر	28
30	اموی دور اور اسلام کے زریں کارنامے	29
31	اموی عہد کی فتوحات	29
32	عباسی دور اور نیم آزاد سلطنتیں	30
33	عربی دور حکومت کا جائزہ	32
34	مطالعہ تاریخ کا درست طریقہ	32
35	حکومتوں پر فقہا اور صوفیا کی نگرانی	33
36	عجمی اقوام کی اہمیت	34
37	بعثت محمدی ﷺ کا بین الاقوامی تقاضا	34
38	اسلامی اجتماع کے ارتقائی مراحل	35
39	اسلام کی اساسی حکمت	36
40	عجمی اقوام کا شاہی دور	36
41	قومی جمہوری تحریکات کی تخم ریزی	37
42	قومی جمہوری دور	38
43	اسلامی بین الاقوامیت کا مستقبل	39
44	خودساختہ نظریہ سازوں کا موہوم تصور	40

www.rahimia.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تاریخ اسلام۔ایک معروضی مطالعہ

بدقسمتی سے ایک طویل زمانے سے ہمارے اہل علم تاریخ کو اِنفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں یہ مرض ہمارے ہاں ظالم بادشاہوں کے دور کی یادگار ہے۔ جبر کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ جماعت کے بجائے فرد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور واقعات کے تغیر وتبدل کو اجتماعی رویوں کے بجائے چند اشخاص کے کردار پر محمول کیا جاتا ہے۔اس کی وَجہ سے ہماری تاریخ کی کتابیں،قوموں کی مجموعی زندگی اور ان کے ارتقا و زوال پر بحث کرنے کے بجائے بادشاہوں اور ممتاز افراد کے حالات کی کتھونیاں بن گئی ہیں۔ اِنفرادیت پسندی کا یہ رجحان ہے،جس نے ہمارے اہلِ علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کردیتے ہیں اور ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اُجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے۔

قوموں کی زندگی اور اجتماعیت

چناں چہ قوموں کی زندگی اور ان کی ترقی میں جماعت کو جو اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے اہلِ علم اس پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو مکہ کی اجتماعی زندگی،قریش کا قومی نظم ونسق، قصی (بن کلاب) کے عہد سے قریش کی تنظیم وتوسیع کے حالات جن کا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کے مشن سے بہت گہرا تعلق ہے۔ وہ ان باتوں کو سرے سے پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ ان کے

ہاں نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت پر صرف اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ ساری نسل انسانی میں ایک مکمل اَور برتر انسان پیدا کرے۔ ہر عالم کے سامنے سیرت نبوی ﷺ کا بس یہ موضوع ہوتا ہے، جسے وہ اعلیٰ استعداد اور مخصوص فکری رجحان کے مطابق پیش کرتا ہے۔ چناں چہ صرف اس طرز پر ہمارے ہاں بڑی کثرت سے سیرت کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

لیکن اس کے برعکس ہم قومی زندگی میں فرد کے بجائے انسانی اجتماع کو اہم مانتے ہیں اور ہم نے شاہ ولی اللہؒ صاحب کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ بھی اِنفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم، یورپ کی سیاست کا مطالعہ اور شاہ ولی اللہؒ کا فکر یہ چیزیں ہی ہیں، جنھوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اجتماعیت کے لیے لادینیت ضروری نہیں ہے۔

اس فیصلے کا میرے افکار پر پہلا اثر یہ ہوا کہ میں نے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لیے ضروری قرار دیا۔ مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور مَیں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا۔ قرآن شریف کو اس طرح سمجھے بغیر اسے دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کرنا، کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر قرآن شریف کی تعلیم کا لب لباب (خلاصہ) صرف یہ ہو کہ وہ ایک اکمل ترین انسان کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور بس! اس لیے ساری دنیا کو یہ پیغام سننا چاہیے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ اور مقتدا (پیشوا) کو اکمل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور خاص طور پر مسیحی قومیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برتر ثابت کریں گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کا جو ہمہ گیر مقصد ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

قریش کا تاریخی تسلسل

برعکس اس کے، مَیں اَب فرد کے بجائے جماعت پر زور دیتا ہوں۔ اور اِنفرادیت کے برعکس اجتماعیت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی ''دعا'' کا پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ مکہ میں قریش کی اجتماعی حیثیت وجود میں آئی۔ کیوں کہ قریش کا فقط یہ اجتماع ہی دین ابراہیمی کا محافظ اور اس کی اشاعت کرنے والا بن

سکتا تھا۔ البتہ ضرورت تھی اَب ایسے فرد کی جوان کو دینی (حنفی) تعلیم دے اور ان میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ کام رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا۔ اَب دنیا کی دوسری اقوام رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تعلیمات سے قریش (صحابہؓ) ہی کی ذریعہ متعارف ہوسکیں۔ اس لیے آپ کا تعلق باقی دنیا سے قریش کے واسطے سے ہوا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے اسلام کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ذریعے ہی نہیں جانا، بلکہ وہ اس اجتماعی تحریک کی بدولت بھی، جس میں قریش پیش پیش تھے، اسلام سے واقف ہوئیں۔ یعنی اسلام کو سمجھنے کے لیے صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر زور ڈالنے کے بجائے اس اجتماعی تحریک کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جو اس ذاتِ اقدس کے اردگرد ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اسلام کو اس طرح سمجھنے سے میرے بہت سے عُقدے (گرہیں) حل ہو گئے۔

قریش کے معاملے میں بھی میں ان میں سے کسی خاص گروہ کی خصوصیت اور اس کے امتیاز کا قائل نہیں رہا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "الائمة من قریش" یعنی قریش میں سے امام ہوں گے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ بارہ سردار ہوں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔ اس بیان سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہاں قریش کا بہ حیثیت مجموعی ذکر کیا گیا ہے۔ قریش میں سے کسی خاص خاندان کو مخصوص نہیں کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے ہم نے چیزوں کو اجتماعی طور پر سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ اور انفرادیت کے رجحان نے ہمارے دماغ خراب کر دیے ہیں۔

قرآن اور اجتماعیت

یہ اجتماعیت اور اجتماعی فکر ہی کا اثر ہے کہ میں سورہ بقرہ کی آخری آیت "لا نفرق بین احد من رسلہ" (ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے) سے یہ سمجھا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیا علیہم السلام پر ایمان لائیں۔ ان انبیا علیہم السلام میں ایک فردِ اکمل رسول اللہ ﷺ ہیں۔ چناں چہ جماعت انبیاؑ سے مکمل قطع نظر صرف اور صرف رسول اللہؐ کی سیرت پر غور کرنا، میرے نزدیک کافی نہیں، غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے شخصی اوصاف میں اس قدر (طریقہ سے) انہماک کرتے

www.rahimia.org

ہیں کہ آپ کی تربیت یافتہ جماعت کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہتی ہے۔ ہمارے اس غلط تخیل کو درست کرنے کے لیے قرآن شریف کا ایک اشارہ کافی ہے۔ سورۃ فتح میں "محمد رسول اللہؐ" کے ساتھ ساتھ "والذین معه" بھی ارشاد ہوا ہے۔ یعنی آپ کی تمام کامیابی کو آپ کی جماعت کا کام بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں ایک مشہور روایت ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر رہے گی۔" اس کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول "ما انا علیه و اصحابی" (یعنی جس طریقے پر میں اور میرے اصحاب ہوں گے، اس پر چلنے والی جماعت حق پر ہوگی۔) نقل کیا گیا ہے۔

ہمارے اس فکر کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے جو قرآنِ عظیم نے ہمیں سکھائی ہے یہ دعا سورۃ فاتحہ میں مذکور ہے۔ اس میں "صراط مستقیم" کی تفسیر "صراط الذین انعمت علیهم" سے کی گئی ہے۔ یعنی سیدھا راستہ وہ ہے کہ جس کے چلنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ ان کا تعین خود قرآن مجید نے کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک "الذین انعمت علیهم" انبیاؑ، صدیقین، شہدا اور صالحینؒ کی جماعتیں ہیں۔ اس سے زیادہ قرآنِ مجید کے اجتماعی تصور کے حق میں اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ہماری توجہ ادھر نہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اجتماعیت سے بے التفاتی برتی اور انفرادیت کے دلدل میں پھنس گئے۔

سورۃ جمعہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے متعلق یہ تصریح کی گئی ہے کہ آپؐ کے پہلے مخاطب "اُمیین" ہیں۔ اُمیین سے مراد عرب کے وہ قبیلے ہیں جنھوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی تھی کہ ہماری نسل سے اُمتِ مسلمہ پیدا کی جائے اور یہ "گھر" یعنی خانہ کعبہ اس کا منبع اور مرکز ہو۔ ظاہر ہے اس اُمت کو ایک نبی کی ضرورت تھی جو دین ابراہیمی کی صحیح معنوں میں تعلیم دے۔ اور اسے تعلیم و تزکیہ کے ذریعے اس قابل بنا دے کہ وہ ابراہیمی دین، دنیا کی تمام قوموں تک پہنچا سکیں۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اس لیے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ قریش کی اِصلاح کر سکیں۔ ان کو تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کر کے ان کو اقوام عالم میں اسلام کا نقیب (علمبردار) اور اس کی نشر و اشاعت کا حامل بنائیں۔

قریش کی اجتماعی حیثیت

بے شک قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن عراق اور پھر فلسطین تھا، لیکن قریشی عربوں کے ساتھ مل کر عرب بن چکے تھے سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ سردار ہوں گے۔ ہم اس پیشین گوئی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اولادِ اسماعیل کے ذریعے عرب میں ابراہیمی دین کی اشاعت ہوگی۔ اور آگے چل کر بارہ سرداروں کی وساطت سے سرزمین عرب حنیفی ملت کا مرکز بنے گی۔

تورات کی اس پیشین گوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعا کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد ''قصی'' نام کا ایک سردار قریش کے منتشر قبیلوں کو مکہ معظّمہ میں آباد کرتا ہے۔ وہ ان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظم دیتا ہے۔ ان کے مختلف قبیلوں کو مختلف کام سپرد ہوتے ہیں۔ ''دارالندوہ'' بنتا ہے، جس میں سب جمع ہوکر اپنے فیصلے کرتے ہیں۔ حج اور باہر سے آنے والوں کے لیے باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ گویا تمہید ہے خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کی۔

قصی بن کلاب (480-400ء) کی یہ جماعت اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سمجھتی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام محض اسماعیلی عربوں کے جدِاعلیٰ نہ تھے۔ بلکہ مسیحی اور موسوی ملتیں بھی ان کو اپنا پیشوا مانتی تھیں۔ اس لیے قصی کی یہ جماعت محض عربوں کی سرداری پر اکتفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بڑے بلند حوصلے تھے۔ یہ ایک طرف تو عرب قبائل کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش میں تھی اور دوسری طرف عراق و شام تک کے علاقوں میں اپنے تجارتی قافلوں کے ذریعے اثر و رسوخ پیدا کررہی تھی۔ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ ان سب قوموں کو یکجا کر کے ایک مجمع الاقوام (کثیر القومی ادارہ) بنائے اور اس کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہو۔ اس جماعت میں خاندانی روایات کے طور پر یہ خیال نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آرہا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنا دے گا۔ یہی جذبہ بنی اسرائیل میں بھی موجود تھا۔ چناں چہ اس بنیاد پر بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں

www.rahimia.org

خاندانوں میں باہمی رقابت بھی تھی۔

بنی اسرائیل میں باہم کش مکش

لیکن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور کسی کو ان کے برابر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا ان کے نزدیک وہی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مصداق تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو بنی اسرائیل تک ہی محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں نے ابراہیمی دین کو سب قوموں کا دین بنانے کے بجائے فقط ایک خاندانی یا زیادہ سے زیادہ ایک قوم کا دین بنا دیا تھا۔

بنی اسرائیل میں سے بے شک مسیح علیہ السلام کی تعلیم غیر اسرائیلی لوگوں تک پہنچی اور ان کے حواریوں نے صابیوں یعنی ''آرین'' قوموں میں بھی مسیحیت کی اشاعت کی۔ لیکن ہوا یہ کہ خود بنی اسرائیل نے مسیح علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ یہود ان کی تعلیم سے بہت کم مستفید ہوئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا لیکن حضرت مسیح کے ماننے والوں نے یہود کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کتاب تورات کی سب سے زیادہ اشاعت کی۔

قریش مکہ کی جدید تنظیم

یہودیوں اور عیسائیوں کی ان کشمکشوں کا اثر قریش کے اہل الرائے بزرگوں پر بھی پڑتا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے کس طرح بڑی سلطنتیں قائم کرلیں ہیں، مگر اس کے ساتھ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ عیسائی، ابراہیمی دین سے دور ہوگئے ہیں۔ اور حنفی ملت کی قیادت سنبھال نہیں سکے۔ یہودی تو ابراہیمی دین کی اشاعت میں ناکام ہو ہی چکے تھے۔ اس سلسلے میں عیسائی بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئے، قصی کی اس جدید تنظیم کے بعد قریش مکہ میں یہ حوصلہ پیدا ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی بڑا آدمی پیدا ہو جو ابراہیمی دین کی دعوت دے اور اس کے قیام کا مرکز بنے۔

قریش کا مکہ میں آباد ہونا اور قصی کے بعد ان میں ایک خاص قسم کی جماعتی زندگی کی

ابتدا، اسے میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ اس دعا کی تکمیل یونہی ہوسکتی تھی کہ ایک اُمت ہو جو دنیا کی تمام اُمتوں کی ہدایت کے لیے اُٹھے، پھر اس اُمت کو بھی ایک امام کی ضرورت تھی جو اسے تعلیم اور تزکیہ کے ذریعے دنیا میں ابراہیمی دین کی اشاعت کے لیے تیار کرے۔

قریش کی امتیازی حیثیت

مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عرب کے دیگر بدوقبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا، صحیح نہیں۔ صحرائی و بدوی زندگی اور اس کے لوازمات و خصائص جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے، قریش ان سے بہرہ ورضرور تھے۔ لیکن عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے۔ قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قصی کے زمانے سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا۔ نیز تجارتی فاصلوں کی وَجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا موقع ملتا تھا۔ اور حج و عکاظ کے میلے کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ ورسم پیدا ہوجاتے تھے۔ یہ اسباب تھے، جن کی وَجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدنی سرمایہ اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کی بدویانہ خصائل سے بھی نابلد نہ تھے۔ چناں چہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کے لیے اجنبی نہ تھے، وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم وحکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھی، ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے۔ البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح اُلجھے ہوئے تھے کہ وہ ادھر توجہ نہیں کرتے تھے۔

قرآن کا مخاطب؛ ترقی یافتہ قریش

قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے۔ قرآن کا خطاب تو قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا۔ مکہ میں قریش کا اپنا ایک باقاعدہ انتظام تھا۔ تجارتی اور سیاسی معاملات سلجھانے کے لیے قواعد وضوابط تھے۔ قومیت کا ان کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں ایسی مذہبی رسوم بنالی تھیں جو ان کے مادی اور

جماعتی مفاد کے لیے مفید تھیں اور اس وَجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا۔ اور موجودہ عہد کے ایک محقق کے الفاظ میں ''متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وَجہ سے یہاں کی آبادی ایک نسلی نہ رہی تھی، اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے، خزاعہ یمن کے تھے، مکہ والوں کی رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے۔ قصی کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ قصی کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی، جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے، جہاں تک قانون کا تعلق ہے، حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم ہونے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن قانونِ معاہدہ اور قانونِ جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام، روایات نے محفوظ رکھے۔ حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم سے بچنے کے لیے ''حلف الفضول'' کے نام سے ایک رضا کارانہ نظام بہ طور تہدید و تدارک وجود میں آگیا تھا، لیکن مکہ کے اس نظام میں چند بنیادی خامیاں تھیں، جن کی بنا پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ مکہ میں سودی کاروبار زُوروں پر تھا۔ امیر طبقہ مال مست تھا۔ تجارت اور سرمائے سے انھیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لیے حبشی غلام خریدتے اور حظِ نفس کے لیے لونڈیاں لاتے۔ چناں چہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں اور شراب کا دور چلتا۔ سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام سے گزر ہوتا تو وہاں سے عیش وعشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے، مکہ کا یہ گنا چنا اوپر کا طبقہ اس لہو ولعب میں منہمک تھا۔ لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی۔

دنیا کا مشکل ترین مسئلہ اور اسلام

دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر متعین کرنا

www.rahimia.org

لازمی ہوا۔ وہ انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کشمکش رہتی ہے۔ صلح و صفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرنا، امیر و غریب کا فرق، آسودہ حال و قلاش کی چپقلش، زمین دار اور کسان کا تفاوت، زرداروں اور بے زر والوں کی آپس میں کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی باہمی بے اعتمادی، اس کش مکش، اس اختلاف اور اس دشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے، دور کرنا ہر صاحب مذہب اور نئے نظام کا فرض ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اپنے زمانہ ظہور میں اسلام کو بھی اس مسئلہ کا حل کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ مذہب اسلام اعلان جنگ تھا، ظالم، فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف جو پس ماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہم پرستی سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے، بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انھوں نے رنگ و نسب کے عجیب و غریب تصورات بنا رکھے تھے۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعے سے روا رکھی جاتی تھی، مذہب ہو یا سیاست تجارت ہو یا اجتماع ان سب کا حاصل یہ ہوگیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے۔

رسول اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں

قریش کے سربرآوردہ طبقے اگر اسی رو میں بہتے چلے جاتے تو ان کا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ چناں چہ رسول اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے قریش کی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ قریش اگر راہِ راست پر آجاتے تو ان کے ذریعے عربوں کی اِصلاح ہوسکتی تھی اور اگر عربوں جیسی جنگ جو اور جری قوم قریش کی قیادت کو مان لیتی تو رسول اکرم ﷺ کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچ سکتا تھا۔ بے شک رسول اکرم ﷺ ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اور قرآن کا پیغام سب قوموں کے لیے تھا، لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اِصلاح و تہذیب ہوجائے تا کہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی اور دوسری عمومی و بین الاقوامی اور آپ کی قومی حیثیت کا مظہر قریش کی قیادت تھی۔ آپ کی بعثت کی بین الاقوامی اور عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام صرف قریش تک

www.rahimia.org

محدود نہ رہا، بلکہ ان کے ذریعے عام عربوں تک پہنچا اور پھر دوسری قومیں بھی زُمرہ اسلام میں داخل ہوگئیں۔ بہ قول حضرت شاہ ولی اللہؒ جناب رسول اللہ ﷺ میں دو خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔ ایک نبوت اور دوسرے ان کے ذریعے قریش کا برتری اور عزت حاصل کرنا۔ نبوت ہر قوم اور ہر نوع کے لیے عام تھی۔ سرخ اور کالے سب کے لیے، مشعل نبوت سے نور حاصل کرنے کے معاملے میں وہ سب برابر تھے۔'' (تفہیماتِ الٰہیہ، جلدا)

جب تک نبوت محمدی ﷺ کی یہ دو حیثیتیں پیش نظر نہ ہوں۔ اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ مؤرخوں نے غلطی سے ان دونوں حیثیتوں کو اس طرح گڈمڈ کردیا ہے کہ بعض دفعہ ان کی باتیں پڑھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسلام خالص عربی تھا وہ صرف عربوں کے لیے تھے، عربوں نے اسے بلند نام کیا، وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آیا اور اَب اگر اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب اُٹھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں۔ گو عجمی قوموں نے تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کر لیا، لیکن وہ مسلمان ہوئی تو اپنے ساتھ الحاد و زندقہ کے جراثیم بھی لیتی آئیں اور ان کی وَجہ سے ''حجازی'' اسلام کا صاف اور پاکیزہ چشمہ گدلا ہوگیا۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ عربی زبان کو مقدس محض مان لیا گیا۔ عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا۔ اور قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع قرار پایا۔ جب کہ اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام اور قرآن کو ان پریشان خیالیوں سے نکالا جائے، بے شک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے، لیکن جہاں تک بعثت محمدی ﷺ کی عمومیت کا تعلق ہے، سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں۔ قریش اور عرب کی یہ برتری استحقاق کی بنا پر تھی۔ اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں۔ اسلام جتنا حجازی ہے، اتنا ہی عجمی بھی ہے اور اتنا ہی ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔

مکی عہد نبوت

الغرض بعثت محمدی ﷺ کی قومی حیثیت کی تکمیل تو یوں ہوئی کہ قریش کے ایک ممتاز گروہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ چناں چہ یہی لوگ نئی تحریک کے چلانے

والے بنے۔ اس گروہ کو اپنے بھائی اور عزیزوں سے جو اس نئی تحریک کے مخالف تھے، لڑنا بھی پڑا، یہ مکہ کی رجعت پسند طاقت تھی، بارہ تیرہ سال تک مکہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑے زور کی کش مکش رہی۔ ایک طرف رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت حمزہؓ، حضرت سعیدؓ اور حضرت مصعبؓ رضوان اللہ علیہم وغیرہم، نوجوان تھے اور دوسری طرف خود آپ ﷺ کے حقیقی چچا اور دوسرے عمر رسیدہ سردار ابوجہل، ابولہب، ولید، عتبہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان رجعت پسندوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ اس جماعت کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے، جو حضرت بلال اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہم جیسے لاوارث اور کمزور تھے ان کو بدنی سزائیں دی جاتیں اور جو قریش کے خاندانوں میں سے تھے، ان کا یہ لوگ مذاق اڑاتے، عام مجلسوں میں ان پر پھبتیاں کستے اور موقع ملتا تو مارپیٹ بھی کردیتے۔ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں کم تھا اور اگر کھلم کھلا لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو شاید ان کو ہزیمت اُٹھانا پڑتی، لیکن اس کے باوجود عرب میں جہاں کی روایات یہ تھیں کہ ایک شخص ہزار کے مقابلے میں ڈٹ جاتا اور جان دے دیتا، لیکن دوسرے کے ظلم کو برداشت نہ کرتا' خلافِ معمول مکہ کے یہ افراد خاموشی سے قریش کے مظالم سہتے اور حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم جیسے جانباز اور غصہ ور بہادر بھی ہاتھ نہ اُٹھاتے۔

بات یہ ہے کہ انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جماعت اس وقت تک نہیں بن سکتی، جب تک کہ انقلاب کے پیغام کو ان تک نہ پہنچایا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس پیغام کو سمجھیں اور ان کے دلوں میں یہ پیغام رچ بس جائے۔ وہ اس پر ایک عرصے تک عمل بھی کرلیں، اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کو برداشت کرنا بھی سکھیں اور ان امتحانوں میں پڑ کر جب وہ نکلیں تو اس قابل ہوں کہ انقلاب کے لیے اپنی جانیں دے سکیں، تیاری کے دور میں عدم تشدد پر عمل کرنا مفید بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔ چناں چہ تاریخ میں اکثر مقدس ہستیوں نے عدم تشدد کی پالیسی پر ایک خاص مدت کے لیے عمل کیا ہے، مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال اس انقلابی جماعت کی تربیت میں گزرے۔

مدنی دور نبوت

ہجرت کے بعد مدینہ میں یہ جماعت جو مکہ میں انقلاب کی پوری تربیت پا چکی تھی، اپنی حکومت بناتی ہے اور مدینہ کے وہ لوگ جوان کے ہم خیال ہو چکے تھے اس کے ''انصار'' بنتے ہیں اور مکہ کی رجعت پسند طاقت اس نئی حکومت سے برسر نزاع ہوتی ہے تو رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھی انقلاب کو بچانے کے لیے میدان رزم میں اُترنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدر کی جنگ میں اس رجعت پسند طاقت کا زور توڑ دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد مکہ والے اُحد میں اپنی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے میں قدرے کامیاب ہوتے ہیں، پھر دو سال بعد خندق کا واقعہ پیش آتا ہے۔ اس میں مکہ والوں کے ساتھ عرب کی دوسری رجعت پسند طاقتیں یعنی یہود اور بدو قبائل مل کر مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں، لیکن وہ اس مجموعی طاقت سے بھی انقلاب کے مرکز کو سر نہیں کر پاتے۔ یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے اور مدینہ کی انقلابی حکومت بتدریج آگے قدم بڑھاتی ہے۔ چناں چہ رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ سے نکلے آٹھ سال ہی ہوئے تھے کہ قریش کی ساری کی ساری جمعیت نے انقلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ مکہ کا فتح ہونا تھا کہ عرب کے دوسرے قبائل بھی جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے اور عرب کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ رسول اللہؐ رحلت فرماتے ہیں تو سارا عرب مدینہ کی نئی حکومت اور اسلام کے نئے نظام کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کی پہلی منزل۔

قریش کے تصورِ قومیت کی اصلاح

رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور فیض صحبت سے اَب قریش اور ان کے پیرو یعنی ان کے دوسرے عرب بھائی بند اس قابل ہوگئے تھے کہ وہ اسلام کے پیغام اور ان کی ذمہ داریوں کا بار اُٹھا سکتے۔ ایک لحاظ سے یہ قدم قریش کی قومیت ہی کی ارتقائی شکل تھی۔ اسلام نے دراصل قریش میں اب تک قومیت کا جو محدود تصور تھا، اسے دوسرے معنی دیے تھے۔ اسلام نے قریش کی قومیت کو جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، مٹایا نہیں بلکہ اسے بحال رکھا۔ البتہ اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔

اسلام قومیتوں سے انکار نہیں کرتا وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے۔ وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے یہ ناممکن ہے اور نہ فطرت اس کو گوارا کرتی ہے۔

اسلام نے قریش کے محدود قومی تصور کو یوں بدلا تھا کہ اَب دوسری قوموں کے اچھے آدمی بھی قریش کی اس اِصلاح شدہ قومیت میں شامل ہو سکتے تھے۔ اسلام سے پہلے قریش کی قومیت صرف مکہ کی چار دیواری تک محدود تھی اور خاص مکہ میں بھی قریش الگ تھے اور غیر قریش عناصر جن کی تعداد غالباً قریش سے کچھ کم نہ تھی، الگ تھے۔ اگر قریش ابولہب اور ابوجہل کے قومی تصور پر چلتے رہتے اور خون اور نسل ہی کو اپنے محدود معنوں میں معیار قومیت مانتے چلے جاتے تو قریش کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اس کے برعکس اسلام نے اس قومی تصور میں اتنی وُسعت اور صلاحیت پیدا کر دی کہ ایک طرف وہ تصور ساری عرب قوم پر مشتمل ہو گیا اور دوسری طرف دیگر قوموں کے اچھے افراد بھی اس قومیت کے انسانی پہلوؤں کو اپنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ قریش اس نئی قومیت کے ترجمان اور قائد تھے اور عرب اور دوسرے لوگ ان کے ساتھی اور سپاہی۔

بعثت نبوی ﷺ کی بین الاقوامی حیثیت کی تکمیل

قریش کی قیادت پر دنیا میں مقصد بعثت محمد ﷺ کو نافذ العمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اس بار کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کر دیا۔ چناں چہ ان کے ذریعے ہی چین سے لے کر فرانس تک بسنے والی خدا کی مخلوق اسلام سے متعارف ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش آپس میں لڑے اور ان کی انقلابی جماعت نے اپنے رجعت پسند بھائی بندوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہمارے خیال میں ابوجہل، ابولہب اور اس قبیل کے نامور قریش سرداروں کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت و دیانت سے انکار نہ تھا اور سکون واطمینان کی گھڑیوں میں وہ آپ ﷺ کو نعوذ باللہ کاذب (جھوٹا) اور مفتری (آیات گھڑنے والا) بھی نہ کہتے ہوں گے، لیکن ان کو اعتراض یہ تھا کہ بلال ایک حبشی زادہ "لاالہ الااللہ" کہنے سے ابوبکرؓ، عثمانؓ اور زبیرؓ جیسے اصیل و نجیب قریشیوں کا کس طرح

www.rahimia.org

بھائی بن سکتا ہے۔

روسائے مکہ کی نظروں میں جو چیز ناممکن تھی، قریش کی اس جماعت نے اسے امر واقعہ کر دکھایا، ابوجہل و ابولہب کا معیار قومیت غلط قرار دیا گیا اور فتح مکہ کے دن قریش کی خاندانی نخوت ونسبی غرور، جو ان کے لیے حقیقت میں جان کا لاگو بن رہا تھا، سب خاک میں مل گیا، کعبہ کی چھت پر بلالؓ کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور قریش کا خون اور نسل کی برتری کا محدود قومی تصور، جو کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ذریعے عوام و خواص سے منوایا جاتا تھا۔ بتوں کے ساتھ وہ بھی رخصت ہوگیا اور اس کے بجائے ایک نیا قومی تصور معرض وجود میں آیا، جس میں کوئی بھی قریش کے افکار و خیالات سے متفق ہوتا، باسانی سما سکتا تھا۔

اسلام کی دعوت ''لاقومیت'' کی دعوت نہیں تھی، بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن گئی۔ اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا جو ذہنی لحاظ سے تو اس وقت کا ایک بین الاقوامی شہر تھا، لیکن وہاں کے رہنے والے جسمانی لحاظ سے بدویوں کی سی صحت و توانائی کے مالک تھے۔ مکہ میں اسلام کے اوّلیں پیروؤں کی جو جماعت بنی، اس میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں قریش بھی تھے، بلال حبشیؓ جیسے بھی تھے اور صہیب رومیؓ بھی تھے۔

مکہ سے جب یہ جماعت مدینہ میں منتقل ہوئی تو اس میں عبداللہ بن سلامؓ ایسے یہودی عالم اور انصار کے بڑے بڑے سردار بھی شریک ہوگئے۔ قرآن مجید نے اس جماعت کو ''السابقون الاولون'' کا نام دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جماعت میں قریش کی حیثیت سب میں ممتاز تھی، لیکن امتیاز صلاحیت کی بنا پر تھا، کسی خاندان یا نسب کی وَجہ سے نہ تھا، درجہ میں سب لوگ برابر تھے۔ چناں چہ اس عہد کی یہ ایک صحیح انٹرنیشنل انقلابی جماعت تھی۔

مکہ کے سر ہونے کے بعد جب قریش کے بچے کھچے عناصر ہی نئی جماعت میں شامل ہوگئے تو یہ جماعت اتنی قوی ہوگئی کہ عرب کی سرزمین میں کوئی عرب یہودی یا عیسائی ان کے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا تھا، چناں چہ عرب کے تمام قبائل اپنے قبیلہ یا قوم پرستیوں سے تائب ہوکر قریش کی نئی قومیت کا حصہ بن گئے اور سب نے قریش کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ حجۃ الوداع میں جو رسول اکرم ﷺ کا آخری حج تھا۔ ایک روایت کے مطابق ایک

لاکھ سے زائد نفوس تھے اور سب کی زبانوں سے "لبیک اللھم لبیک" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سب کا ایک خدا، ایک نبی، ایک قوم اور ایک شاہراہ زندگی تھی۔

ردِ انقلاب کی ناکام کوشش

لیکن عرب سے رجعت کے جراثیم ابھی پوری طرح فنا نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کے رحلت فرماتے ہی عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ردِ انقلاب کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چناں چہ مدینہ اور مکہ کی اس جماعت کو دوبارہ عربوں کو بزور شمشیر فتح کرنا پڑا اور انھیں قریش کی قیادت ماننے پر مجبور کیا گیا۔ ارتداد کا طوفان بڑا سخت تھا، لیکن انقلابی جماعت کے ایمان اور ہمت سے یہ بلا ٹل گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ارتداد کے خلاف جو بڑے بڑے معرکے ہوئے ان میں پیش پیش مکہ کے نوجوان قریشی تھے، جن کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ارتداد حقیقت میں عرب کے بدو قبائل کی رجعت پسندی کا مظاہرہ تھا۔

قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافت راشدہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ صحابہؓ آپ ﷺ کے کاموں کو جاری رکھتے ہیں، یہ "السابقون الاولون" کی جماعت تھی۔ (1) انھوں نے آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چنا، (2) حضرت ابوبکرؓ کے بعد ان کی رائے سے حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے (3) اور یہی جماعت بھی جنھوں نے باتفاق رائے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جگہ منتخب کیا۔ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے (4) اور اسی جماعت کے غالب حصے نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مانا۔ بے شک اس کی وجہ کوئی خاندانی اعزاز یا نسبی امتیاز نہ تھا، جیسا کہ بعد میں غرض مندوں نے سمجھ لیا، بلکہ بات یہ تھی کہ مکہ میں اسلام سے بہت پہلے قصی کے زمانے سے ہی قریش کی ایک ایسی نسل پل رہی تھی جو عرب کی قیادت کی صلاحیت رکھتی تھی، یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں سے سمجھتے تھے۔ اپنے مذہب کو دین ابراہیمی مانتے تھے، چوں کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام عربوں کے مورث اعلیٰ تھے اور بنی اسرائیل بھی انھیں کو اپنا بڑا جانتے تھے نیز غیر اسرائیلی یعنی قحطانی

عرب بھی اسماعیلیوں سے گھل مل رہے تھے، اس لیے ان روایات نے قریش کے ذہنوں میں بڑی وُسعت کا امکان پیدا کردیا تھا۔ دوسری طرف قریش پڑوس کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے مذاہب سے بھی آشنا تھے اور اپنے آپ کو ان سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے۔ ان کا پھر تجارتی سفروں کی وَجہ سے ان ممالک میں آنا جانا بھی تھا۔ نیز مکے میں رہتے ہوئے جو عربوں کا دینی اجتماعی اور ایک حد تک تجارتی مرکز بھی تھا وہ عربوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے تھے۔

قریش کی قیادت اور بعثت محمدی ﷺ کا باہم تعلق

ان داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر قریش میں سے آئمہ (لیڈرز) کا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چناں چہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے قریش میں سے ہی امیر کو چننے کے حق میں جہاں اور دلیلیں دی تھیں اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب قریش کے سوا کسی اور کی امارت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔

مختصراً اسی طرح قریش کا عرب کی قیادت کی سعادت حاصل کرنا بعثت محمدی ﷺ کا ایک لازمی نتیجہ بن گیا۔ چناں چہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و قریش صحابہ کی طرف بحث و مناظرہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے قریش کی قیادت و امارت کے اصول کو تسلیم کرلیا۔ تاہم حضرت ابوبکرؓ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ہم (قریش) انقلاب کی قیادت کریں گے اور تم (انصار) ہمارے دست و بازو (وزیر) ہوگے۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ ساعدہ میں جس حدیث "الآئمة من قریش" کے حوالے سے قریش کی امارت کے حق میں جو دلیل دی تھی، بعد میں تاریخی واقعات نے بھی ان کے اس دعوی کی تصدیق کردی۔ چناں چہ عربوں کی جہاں کہیں حکومتیں بنیں قریش کے خاندان کے لوگ ہی ان میں برسر اقتدار آئے۔ امویوں کے وارث عباسی بنے، اسپین میں جو عربی سلطنت قائم ہوئی اس کے فرماں روا اُموی تھے اور مصر میں قریش ہی کی فاطمی شاخ اپنی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ امویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا دور ختم ہوا تو عرب بھی مسند اقتدار سے برطرف کردیے گئے اور ان کی جگہ مسلمانوں کی دوسری قوموں نے لے لی۔

www.rahimia.org

جماعت صحابہ میں اختلاف رائے

حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے تک مرکزی جماعت کا اتفاق قائم رہا۔ اس عہد میں صحابہ کی دو جماعتیں بن گئیں ایک جماعت سمجھتی تھی کہ اگر حاصل شدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ نہ کی گئی تو سلطنت میں بڑا انتشار پیدا ہوجائے گا۔ پھر ایک طرف بدوعرب بھی بے قابو ہو رہے تھے اور دوسری طرف مفتوحہ اقوام ہنوز پوری طرح مطیع نہ ہوئی تھیں۔ اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے لیے عربوں کو بہ حیثیت ایک قوم کے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کے برعکس دوسری جماعت عربیت کو موخر اور ابتدائی زمانے کی اسلامیت کو مقدم رکھنا چاہتی تھی۔ چناں چہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں یہ کش مکش زوروں پر رہی، مرکزی جماعت کے اس اختلاف سے عربوں کے شورش پسند طبقوں نے فائدہ اٹھایا اور حضرت عثمانؓ شہید کردیے گئے۔ ان شورش پسند عربوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا یہ دراصل بدوؤں کی پرانی نراجی (انتشاری) ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔ بے شک حضرت علیؓ کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد کو تازہ کرنا تھا، لیکن ان کو کوفہ اور بصرہ کے جن لوگوں سے سابقہ پڑا وہ عہد اوّل کی بلند نظری تو کجا، عربی تنظیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ حضرت علیؓ کا بلند نصب العین واقعی قابل تعریف تھا لیکن جن لوگوں کے ذریعے وہ اس نصب العین کو عمل میں لانا چاہتے تھے وہ بین الاقوامی تنظیم تو کیا، قومی تنظیم سے بھی ناواقف تھے۔ ان کے برعکس امیر معاویہؓ عربوں کو بہ حیثیت ایک قوم کے منظّم کر کے اسلام کا محافظ بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے شام والوں کو عربیت کے نام پر جمع کیا، نصب العین تو ان کا بھی اسلام رہا، لیکن ان کا یہ نصب العین عرب قوم کا قومی مسئلہ بن گیا۔

خانہ جنگی کی حقیقت

ہمارے نزدیک حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے اور حضرت علیؓ کے خلافت کے دور میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیں ہوئیں انھیں یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک یہودی مفسد یا چند بدطینت منافقوں کی سازش کا نتیجہ تھا، ٹھیک نہیں۔ خود انصاف فرمایئے کہ ایک طرف تو یہ کہا

www.rahimia.org

جائے کہ اسلام کا نظام سب سے برتر اور اعلیٰ ہے اور جن بزرگوں نے اس نظام کو عملی شکل دی وہ دنیا کے بہترین لوگ تھے۔

اگر یہ صحیح ہے اور ہم مانتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ایک یہودی یا چند نابکار اس نظام کو آسانی سے درہم برہم کر دیتے۔ اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے تو لامحالہ کہنا پڑے گا کہ اسلام کا نظام اور اس کے کارفرما نعوذ باللہ اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کا لگایا ہوا پودا ایک معمولی سے جھکڑ کا مقابلہ کر سکتا۔

کسی نظم کی برتری اور اس کے نافذ کرنے والوں کی عظمت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام نافذ کرنے والوں کے بعد بھی قائم رہے اور نہ صرف قائم رہے بلکہ اور ترقی کرتا جائے ورنہ تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم میں کوئی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی اور اس نے ایک مختصر مدت میں قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن جونہی وہ شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی اس کے ساتھ اس کی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہوگئی۔

خدا نہ کرے اگر تاریخ اسلام کے ان نظریات کو مان لیا جائے جو آئے دن ہمارے بڑے بڑے ''ارباب علم وفضل'' پیش کرتے ہیں اور اپنے ان نظریات کی بنا پر دنیا سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ ان کے نظام کو سب نظاموں سے افضل اور مفید تر مان لے گی جو بہ قول ان کے صرف تیس برس تک ٹھیک چلا اور جس کے ان تیس برسوں کے بھی آخری دس سال آپس کی لڑائیوں اور خونریزیوں میں گزرے۔

انقلابات کی ایک معروضی حقیقت

بات یہ ہے کہ انقلاب کے ہنگامے میں ہر مزاج اور ہر رجحان کے آدمی باہم مل جاتے ہیں۔ ان کا یہ اتحاد داخلی سے زیادہ خارجی اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ انھیں چوں کہ مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی دشمنی اور عداوت ناہم جنسوں کو بھی اکٹھا کر دیتی ہے۔ چناں چہ ہر خیال کے آدمی جن کا نصب العین انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے۔ اس جماعت میں شریک ہوتے ہیں انقلاب کی کش مکش میں جہاں ہر آدمی کو مرنے مارنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ طبیعتوں کے یہ اختلافات ابھرنے نہیں پاتے اور جماعت میں یکجہتی قائم رہتی ہے، لیکن جونہی مخالف قوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور سامنے کوئی

فوری اور سخت خطرہ نہیں رہتا تو پھر دبے ہوئے، جذبات ابھرتے ہیں شروع شروع میں نظری اختلافات ہوتے ہیں۔ پھر ہر خیال کا ایک گروہ بن جاتا ہے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خود انقلابی جماعت آپس میں پھٹ جاتی ہے اور دوسروں سے لڑنے کے بجائے یہ باہم دگر لڑنے لگ جاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی انقلاب برپا ہوا ہمیشہ ہنگامہ انقلاب کے سرد پڑتے ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی، لیکن یہ خانہ جنگی انتشار یا زوال کی علامت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کام کرنے کے متعلق مختلف رائیں ہوجاتی ہیں۔ اَب اگر ہر ایک رائے کو مان لیا جائے تو جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا اس لیے ضرورت پڑتی ہے، کی ایک رائے والے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالیں۔ لیکن دوسرا فریق بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی دلیل و منطق سے وہ قائل نہیں ہوتا۔ اس لیے لازمی طور پر تلوار سے معاملہ کو نبٹانا پڑتا ہے۔

پارلیمانی نظام کے لئے امن کی شرط

پارلیمنٹری نظام میں یہ جھگڑا عام انتخابات کے ذریعے طے ہوجاتا ہے اور تلواروں کے بجائے ووٹوں سے جمہور فیصلہ کردیتے ہیں کہ کون سا فریق برسرِاقتدار ہو۔ ہارنے والی جماعت اس فیصلے کو تسلیم کرلیتی ہے، لیکن غالب فریق شکست خوردہ جماعت کو خارج از بحث نہیں کردیتا، بلکہ اس کو شریک حکومت بناتا ہے۔ اس سے مشورے لیتا ہے اور بعض دفعہ اگر ان کا مشورہ صحیح سمجھے تو اسے قبول بھی کرلیتا ہے۔ ہارنے والی جماعت، غالب فریق کی حکومت صرف اس لیے تسلیم کرلیتی ہے کہ اسے یہ اُمید ہوتی ہے سال، دو سال یا پانچ سال کے بعد ہم پھر جمہور سے استصواب رائے کرسکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اَب کہ ہم غالب آئیں، لیکن یاد رہے کہ پارلیمنٹری نظام صرف امن و امان اور عام حالات ہی میں چل سکتا ہے۔

غیر معمولی حالات اور انقلابیوں کا کردار

اس کے برعکس کسی انقلاب کا ہونا خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ملک کے حالات غیر معمولی تھے۔ اس لیے باتوں اور رائیوں کے بجائے تلواروں سے کام لینا پڑا۔ اس سے

www.rahimia.org

کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انقلابی طبعاً خون آشام ہوتے ہیں آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ لوگ جن کو اپنی دعوت انقلاب کے سلسلے میں تلوار چلانی پڑی ان میں اکثر ایسے تھے کہ جو بڑے رقیق القلب (رحم دل) تھے، وہ بچوں کے ساتھ ہوتے تو بالکل معصوم بچے بن جاتے، وہ طبیعت کے بے حد نرم اور مزاج کے بڑے ٹھنڈے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے زمانے کے لوگ دلیل کے بجائے محض تلوار کو حکم اور پنچ مانتے تھے۔ چناں چہ ان بزرگوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی اور جب انقلاب میں تلوار چلی اور تلوار ہی حکم ٹھہری تو ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد خود انقلابی جماعت میں جو اختلاف ہوا اس کا فیصلہ بھی تلوار سے ہوا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور اس عہد کی دوسری لڑائیاں دراصل دو رائیوں کا تصادم تھا۔ عام حالات ہوتے تو دونوں جماعتوں میں ووٹوں کے ذریعے فیصلہ ہوجاتا، لیکن وہ زمانہ اور تھا ہر شخص شمشیر بند تھا اس لیے اس کی رائے کا اظہار شمشیر ہی سے ہوا۔

اسلام، ایک انقلابی دین

بے شک رسول اکرم ﷺ کے بڑے ممتاز اور قریبی صحابہؓ میں تلوار چلی۔ اسلام کے مخالف اس پر ہنستے ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ ان کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں بیان کرتے ہیں، دَبی زبان میں کچھ کہتے، تو بعد میں جو بات کہی تھی اسے اَن کہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی نظر سے دیکھا جائے تو سارے معاملات واضح ہوجاتے ہیں اور کسی کو بُرا بھلا کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور دل میں کچھ اور زبان وقلم سے کچھ اور کہنے اور لکھنے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

ایران، شام اور مصر کو فتح کرنے اور کسریٰ کو ختم اور قیصر کو ایشائی مملکت سے محروم کرنے کے بعد عربوں کا انقلابی جوش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اَب حالت یہ تھی کہ ایک بدو مدینہ سے اونٹ پر سوار ہوتا تو اسلامی سلطنت کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے اس کا دم ختم ہوجاتا۔ پہلے عرب اپنے آپ کو مخالف قوتوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اور ہر طرف ان کے ایسے دشمن بھی موجود تھے، جن کا سر کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ قدرتی طور پر اس زمانے میں

www.rahimia.org

ان کی طبیعتوں کا انقلابی رجحان پورے عروج پر تھا، لیکن جب انھیں اتنی بڑی سلطنت مل گئی اور ان کے سامنے کوئی فوری خطرہ بھی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ اس جوش وخروش میں بھی کمی آ گئی۔ اگر عربوں میں واقعی اس وقت انقلاب کا پہلا سا زور ہوتا تو حضرت علیؓ جیسے اولوالعزم خلیفہ کو نامساعد حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

عربوں کی قومی حکومت اور بنواُمیہ کا عروج

جب حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ''السابقون الاولون'' کا عہد ختم ہوگیا اور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو چلانے والی اس وقت کوئی جماعت موجود نہ تھی جو سب قوموں کی نمائندہ ہوتی، بلکہ اس وقت تک عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے بہ حیثیت مجموعی اسلام قبول بھی نہ کیا تھا تو ان حالات میں یقیناً عرب ہی اس تحریک کے محافظ اور علمبردار بن سکتے تھے۔ اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک عام عربوں کے لیے بین الاقوامی تحریک بن گئی اور اس کی حفاظت اور بقا ان کی قوم کی موت و زندگی کا سوال ہوگیا۔ اور لامحالہ اس کا اثر حکومت کی روش پر بھی پڑا۔ گو اسلام کی بین الاقوامیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی، لیکن عملاً عربوں نے آہستہ آہستہ اس بین الاقوامیت کو اپنے قومی دائرے میں لے لیا، کیوں کہ اس وقت اس کے بقا کی صرف یہی صورت ممکن تھی۔ اگر عرب اس کو اپنا قومی مسئلہ نہ بنا لیتے تو اسلام کی بین الاقوامیت مختلف عناصر کی کھینچا تانی کے ہاتھوں کبھی منڈھے نہ چڑھ سکتی۔

جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنالیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ برسرِعروج ہوتا۔ یہی وَجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنوامیہ کو ملی۔ حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے۔

عام عربوں کا رجحان بنوہاشم کے مقابلے میں امویوں کی طرف زیادہ تھا، اور اس کے اپنے اسباب ہیں۔ علوی، خاندانِ رسالت میں ہونے کی وَجہ سے اپنے آپ کو دوسرے عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد امویوں کا برسرِاقتدار آنا' حقیقت میں

اسلامی اصولوں سے کسی قسم کی بغاوت نہ تھی، بلکہ اموی دورِ اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقا کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔

مؤرخین کی ناانصافی

ہمارے تاریخ نگاروں نے بنوامیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنوامیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تخت و تاج کے وارث بنے، انھیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ پہلے ہم بھی بنوامیہ کے خلاف اپنے مؤرخوں کی باتیں پڑھ کر متأثر ہوجاتے تھے، لیکن اَب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بہ غور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان کو جانا تو ہم پر اموی دور کی اصل حقیقت واضح ہوگئی، جس زمانہ میں بنوامیہ کے خلفا سلطنتوں کے مالک ہوئے، اس زمانہ میں بادشاہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسئولیت سے بالا سمجھتے تھے، لیکن یہ عدم مسئولیت صرف شخصی اور نجی زندگی تک محدود ہوتی۔ جہاں تک قوم اور ملک پر حکومت کا تعلق تھا' اس کے لیے ایک معین دستور اور قانون تھا اور جو بادشاہ یا فرماں روا اس مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کرتا۔ اس کی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی۔ بدقسمتی سے ہمارے تاریخ نگاروں نے فرماں رواؤں کے ذاتی حالات اور خانگی زندگی کے واقعات کو تاریخ میں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

نئی انقلابی حکمت عملی

جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحہ عمل کو نیا رنگ دے۔ شروع شروع میں تو قوم کے سارے کے سارے افراد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں اور اگر کسی سبب سے حرب و ضرب کا سلسلہ رک جائے تو ان میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں یہی ہوا، حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو سمجھا اور انھوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی۔ اور عرب بہ حیثیت قوم کے اس کے حامل و محافظ بن گئے۔ چناں چہ

حضرت امیر معاویہؓ نے دمشق کو پایۂ تخت بنایا اور اپنا بحری بیڑہ (جو سترہ سو جہازوں پر مشتمل تھا۔) تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کردیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی اس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب جو آپس میں لڑلڑ کر فنا ہورہے تھے، پھر متحد و متفق ہوگئے اور خشکی و تری میں ان کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔

اموی دور میں بین الاقوامی اسلامی فکر

ہم نے بنوامیہ کی غلطیوں کو تو خوب اچھالا، لیکن ان کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں، ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔ بے شک امویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا، لیکن انھوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی قومی حکمت کے تابع نہ بنایا۔ چناں چہ عہد اموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا' لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی۔ یہ صحیح ہے کہ اموی حکومت کے ایوانوں میں غیرعرب مسلمان پیش پیش تھے اور جمہور ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔اسی زمانہ کی بات ہے کہ حضرت حسنؒ، جو بصری کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں اور وہ غیرعرب تھے۔ اپنی تقریروں میں اموی حکومت پر نکتہ چینی کرتے، ہزاروں کا مجمع ہوتا اور کسی کی مجال نہ تھی ان کی اذیت کے درپے ہوتا۔

الغرض اموی حکومت کی سیاست تو بے شک عربی امتیاز کو لیے ہوئے تھی، لیکن اس سیاست سے جو علمی نتائج مرتب ہوئے وہ مفتوح قوموں کے حق میں بے حد مفید تھے۔ عربی فتوحات نے مفتوحہ ملکوں کی قوموں کے اوپر کے طبقے کو، جن کے بار تلے ان کے عوام بُری طرح کچلے جارہے تھے، ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ نیز جہاں جہاں عرب فاتح گئے ان کے ساتھ اسلام گیا،فتوحات کا سیلاب تو آیا اور گزر گیا' لیکن اسلام کے عقائد جس جس سرزمین پر پہنچے، وہاں کے لوگوں کی ذہنی اور جماعتی زندگیوں کو بدلتے چلے گئے۔ پہلے کے مذاہب جو بے جان اور بے روح کھلونے بن چکے تھے۔ اسلام کے فکری طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ پرانی دنیا اپنی تمام فرسودگیوں کے ساتھ رخصت ہوئی اور تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔

اموی دوراور اسلام کے زریں کارنامے

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسا پایا تھا اور اس کی کایا پلٹ دی۔ اسلام کے اس زریں کارنامے کی صدائے بازگشت غیر مسلم مؤرخین کی زبانی سنیے۔

ایم این رئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی، جس نے عرب قبائل کو متحد کر دیا، کچھ ہی عرصہ بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشائی وافریقی صوبے آگئے جو قدیم متزلزل نظام سے نکلنا چاہتے تھے۔ عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی۔ وہ اپنے کمزور کندھوں پر خانقاہیت (رہبانیت) کا بوجھ لیے کانپ رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں عربستان سے اُمید کی کرن پھوٹی۔ اسلام کی تلوار بہ ظاہر خدا کی خدمت کے لیے بلند ہوئی، لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگ بنیاد رکھا، جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور (بیکار) قدیم مذاہب کو گہری نیند سلا دیا۔''

اسلام کے اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور اجتماعی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے:

''اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانہ کی عربی تہذیب کے اَثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی، ایرانی، بازنطینی اور قبطی سب ایک لاعلاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ عربوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کی وَجہ سے ان کی سستی دور ہوگئی اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہوگئی۔''

اموی عہد کی فتوحات

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا۔ یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی، لیکن اسلامی انقلاب سے جو شان دار اور دوررس نتائج برآمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی۔ اموی فتوحات کی وَجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہوسکے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے

www.rahimia.org

فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔اس وقت ممالک فارس وروما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ ایک نیا سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لے کر اُٹھے اور تاریک دنیا میں علم کا نور پھیلا دے۔ مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور روم کے ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔

بنوامیہ کی عربی حکومت نے ایک تو ممالک فارس وروم کے کھنڈرات صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ دوسرے فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو عام بھی کیا۔ اس طرح مفتوحہ ممالک کی قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر مجبور ہوگئے۔ موسیولیبان کے الفاظ میں: ’’خوں ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں بویا گیا تھا، ازسرنو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے اُفق روشن ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت وجلال کے ایک شان دار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔‘‘

عباسی دور اور نیم آزاد سلطنتیں

اسلام کے عالمگیر انقلاب کی دوسری منزل یہاں ختم ہوتی ہے۔اور عباسیوں سے اس کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے دور میں قریش سارے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتے ہیں، دوسرے دور میں قریش اور عرب مل کر دنیا کے ایک وسیع رقبے کو اسلام کے زیراثر لے آتے ہیں۔ گوعہد اموی میں حکمران طبقوں میں عربی رنگ غالب تھا، لیکن اہل علم، اسلام کی عمومی حیثیت کی بڑی شدومد سے اشاعت کرتے رہے۔ چناں چہ اس عمل اور ردِعمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیرعرب مسلمان بھی حکومت میں مساوی حیثیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ اموی عرب پہلے کی طرح عرب قومیت کو ہی اشاعت اسلام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک صدی میں کتنی اور قومیں مسلمان ہوچکی ہیں۔ اور اَب ان کے وجود کا انکار کرکے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ عباسیوں نے بدلتے ہوئے زمانے کی

اس ضرورت کو سمجھ لیا اور وہ ایرانیوں کو ساتھ ملا کر امویوں سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہوگئے۔ عباسی دور آتا ہے تو عرب اور غیرعرب مسلمان مل جل حکومتیں قائم کرتے ہیں۔ گو اخلاقی سیادت عربوں کے ہاتھ میں رہتی ہے، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں پر غیرعرب چھا جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ عربوں کا اخلاقی اقتدار بھی کم ہوجاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایرانی اور ترکی قومیں اسلام کے بین الاقوامی مرکز کی مالک بن جاتی ہیں اور عربوں کی حیثیت دوسرے درجے کی رہ جاتی ہے۔

مدینہ منورہ اسلام کے اوّلین بین الاقوامی اور انسانی دور کا مرکز تھا۔ دمشق خالص عربی قوموں کا مرکز بنا۔ بغداد میں عرب امیر اور ایرانی وزیر تھے۔ ایرانیوں نے بغداد کی عباسی خلافت کے زیرِ تربیت حکومت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی۔ شروع شروع میں تو ایرانی دبے دبے رہے۔ اور اگرچہ عباسی خلفا نے عربی سیادت کو برقرار رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ چناں چہ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون نے، جب بھی انھیں موقع ملا، اپنے ایرانی وزرا اور امرا کو جو سلطنت میں بڑے دخیل اور صاحب قدر تھے، بے دریغ قتل کروایا۔ اور ایران کے قدیم افکار کو جو اسلام پر غالب آنے یا اسے اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے سر اُٹھا رہے تھے، بڑی سختی سے کچلا۔ لیکن ہارون کے بیٹے مامون کا اپنے بھائی امین کے مقابلے میں کامیاب ہونا' دراصل عربوں کے خلاف ایرانی عنصر کی فتح تھی۔ اس عہد میں عباسی خلافت کی فوج میں عربوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔ مامون کے بعد معتصم اور واثق کا زمانہ آیا تو ترک، جنھیں ہم تمدنی اعتبار سے ایرانی ہی کہتے ہیں' خلافت ِعباسی کے سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے۔ مامون نے اپنے عہد خلافت میں غیرعرب مسلمانوں کو حکومت کا اہل پا کر انھیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے بھی دیئے اور بعض کو تو صوبوں کی مستقل حکومتیں بھی عطا کیں۔ اسی زمانے سے عباسی خلافت کے ماتحت شرق و غرب میں نیم آزاد سلطنتیں بننا شروع ہوتی ہیں۔ جو اپنے اندرونی معاملات میں تو مستقل تھیں، لیکن حاکمیت بالا عباسی خلفا ہی کی تسلیم کرتی تھیں، چناں چہ مشرق میں بخارا، غزنی اور بعد میں دہلی کی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ اور ادھر مغرب میں مصر اور مراکش کی حکومتیں بنیں۔ اس طرح تقریباً پانچ سو برس اسلام کی مرکزی قوت عرب اقوام کے ہاتھ میں رہی۔ ان اقوام کی امامت قریش نے کی۔

عربی دورِ حکومت کا جائزہ

قرآنِ حکیم کی اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش تھا۔ قریش کی امامت تقریباً پانچ سو سال تک رہی۔ اس کے ابتدائی دور میں قریش میں وہ بارہ سردار ہوئے، جن کی خوش خبری رسول اللہ ﷺ نے دی تھی۔ (ان کے تعین میں ایک رائے کے مطابق چاروں خلفائے راشدینؓ، امیر معاویہؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، عبدالملک، اس کے چاروں صاحبزادے اور ایک پوتا ولید بن یزید شامل ہیں، دوسری رائے کے مطابق خلفاء راشدینؓ، حضرت معاویہؓ، عبدالملک، اس کے تین صاحبزادے ولید، سلیمان اور ہشام کے علاوہ تین عباسی خلفاء منصور، مہدی اور ہارون الرشید شامل ہیں۔) ان سرداروں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مٹا کر دنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر اسلامی سلطنت قائم کی۔ اس حکومت کو اگر سیاسی شعور کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ انسانیت کے لیے ایک نمونے کی حکومت تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ”میری حکومت کو دیکھو اور غور کرو، کوئی اندھا نہیں، جس کے لیے مَیں نے عصا بردار مقرر نہ کیا ہو، اور کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے، جس کو کھانا اور دوا نہ پہنچی ہو۔“

ولید بن عبدالملک کی حکومت ایک عرب سردار کی حکومت تھی۔ خلیفۂ راشد کی حکومت نہیں۔ خلفائے راشدین کی حکومت تو گویا ایک مثالی حکومت تھی۔ تاہم قریش کے ان دیگر سرداروں کی حکومت بھی کچھ کم شان دار نہ تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی حکومتوں کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ بے شک یہ لوگ شان دار زندگی گزارتے تھے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع اور اس کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے اور رعایا کے عمومی مفاد کو نظرانداز نہ کرتے تھے۔

مطالعہ تاریخ کا درست طریقہ

بدقسمتی سے ہمارے مؤرخین نے تاریخ کو اجتماعی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بہ حیثیت مجموعی کسی تحریک، حکومت یا اجتماع کو دیکھتے وہ حکمران کی خانگی زندگیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہماری تاریخوں میں ان فرماں رواؤں کے ذاتی اور شخصی نقائص بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ

ایک مؤرخ کے نزدیک جس خاندان کو حکومت ملنی چاہیے تھی اس کے بجائے اس کے مخالف کو حکومت مل گئی اور اوّل الذکر کی مؤخرالذکر سے جنگ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ''قلم بدست دشمن'' کا معاملہ تھا اس لیے یہ مؤرخ ان حکمرانوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے وہ کم تھا۔

ہمیں چاہیے کہ اَب ہم تاریخ کو اس طرح نہ پڑھیں بلکہ ایک حاکم نے عام انسانیت کے لیے جو کچھ کیا ہمیں اُسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چناں چہ اگر شاہانِ اسلام کے اجتماعی کام اچھے تھے تو اُن کے شخصی نقائص اور اُن کا اوروں سے تھوڑا بہت مالی تفوق (یعنی اوروں سے مال کی زیادتی) یہ ایسی چیزیں نہیں کہ ہم انھیں اتنی زیادہ اہمیت دیں۔ آخر مسلمانوں کے علاوہ اور قوموں میں بھی بادشاہ گزرے ہیں، مسلمانوں کے اِن حکمرانوں کا اُن سے مقابلہ کیجیے۔

حکومتوں پر فقہا اور صوفیاء کرام کی نگرانی

بے شک اسلامی حکومتوں کا یہ عہد محدود مطلق العنانی (شخصی حکومت) کا عہد تھا اور فرماں روا جو چاہتے تھے، کرنے کے مجاز ہوتے تھے۔لیکن اس زمانے میں ملک میں ایسی بااثر جماعتیں بھی ہوتی تھیں جو ان حکمرانوں میں اعتدال پیدا کرتی تھیں اور ان کو حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا کرتی تھیں۔ یہ فقہا اور صوفیا کی جماعتیں تھیں۔ فقہا قانون کو نافذ کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ ایک فقیہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا اور ساری قلمرو کے قاضی اس کے ماتحت ہوتے۔ چناں چہ بادشاہ ان قاضیوں کے فیصلوں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتا تھا۔اس طرح اسلامی قانون بادشاہ کی سیاست سے آزاد رہتا اور اس کی سلطنت میں ایک مستقل حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ ملک کا دوسرا عنصر جو ان حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے آڑے آیا کرتا وہ صوفیا کا گروہ تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ 561 ہجری میں بغداد میں اپنی خانقاہ میں بیٹھے خلفا کے احکامات پر تنقید کیا کرتے اور خلفا تھے کہ آپ کی ان باتوں کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتے۔ عربی حکومت کا یہ آخری دور تھا۔ اس سے پہلے جب عربی حکومت میں زیادہ قوت تھی اور اس کے فرماں روا بڑی طاقت و اقبال کے مالک تھے تو وہ صوفیا اور زاہدوں کی صحبت اور نصیحت کو اپنے لیے سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ خطیب

www.rahimia.org

بغدادی نے خلیفہ ہارون الرشید کے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔

عجمی اقوام کی اہمیت

سورۃ جمعہ میں جہاں اس امر کی صراحت یعنی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ''امیین'' یعنی عربوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ سورۃ جمعہ کی پوری آیت یہ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

(وہی ذات اقدس ہے، جس نے ''امیین'' میں سے ان کے لیے رسول بھیجا جو ان کو آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ نیز اس ذات اقدس نے اس رسول کو ان لوگوں کے لیے بھیجا ہے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ بے شک وہ ذات بڑی عزت والی اور حکمت والی ہے۔)

ہمارے نزدیک "وآخرین منھم" کے مصداق اہل ایران، اہل ہند اور دیگر عجمی قومیں ہیں جو بعد میں شامل ہوئیں۔ یا آئندہ ہوں گی۔ "امیین" کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بعثت یہ تو اسلام کا قومی منصب تھا۔ "آخرین منھم" کو ہم قرآن کی بین الاقوامی تعلیم کا حاصل سمجھتے ہیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت جیسے عربوں کے لیے تھی ویسے ہی عجمیوں کے لیے بھی ہے۔ اَب "آخرین منھم لما یلحقوا بھم" (یعنی بعد میں آکر ملنے والے لوگوں کا) کا زمانہ آتا ہے اور عربوں کے بجائے یہ لوگ اسلام کی بین الاقوامیت کے محافظ اور سرپرست بنتے ہیں۔

بعثت محمدی ﷺ کا بین الاقوامی تقاضا

اگر اسلام کو صرف عربی اقوام کے لیے معین کردیا جائے تو غیر عرب مسلمان اقوام

www.rahimia.org

نے جو بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں، وہ اسلامی اجتماع پر ایک دنبل (پھوڑا) بن کر رہ جائیں گی، لیکن اگر بعثت محمدی ﷺ کی دونوں حیثیتیں یعنی قومی اور عمومی ملحوظ رہیں تو قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آجائیں گے۔ بے شک عرب اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے قرآن کی اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر کے دکھایا جو قیامت تک انسانی نسلوں کے لیے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لیے نمونہ کا کام دیں گے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کی مرکزی حکومت کمزور ہونے سے اسلام ہی ختم ہوگیا۔

چناں چہ کئی سو سال تک اسلامی دنیا کی یہ حالت رہی کہ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی جگہ آزاد تھا اور نظم و نسق سلطنت میں وہ کسی دوسری طاقت کو اپنا حاکم بالا نہ مانتا تھا، لیکن اس کے باوجود بغداد میں اور پھر قاہرہ میں ایک نام کی اسلامی خلافت قائم رہی، جس کے ساتھ دور ہی سے عقیدت کا اِظہار کرنا سلاطین و ملوک کافی سمجھتے تھے۔ یہ اسلامی خلافت حقیقت میں اسلام کے اس تصور کی یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔

اسلامی اجتماع کے ارتقائی مراحل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ قریش کی اموی خلافت کے دوران نومسلم ایرانیوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ عباسی آئے تو اسلامی ایران ان کے ساتھ مل کر حکومت کا کام سیکھنے لگا۔ اس طرح خلفائے عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کے لیے تیار کر دیا۔ بغداد میں تو خلفائے عباسیہ کے وزرا ماتحت کی حیثیت سے وہ اسلامی سلطنت میں شریک تھے، لیکن ادھر مشرق میں انھوں نے اپنی مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھی۔ چناں چہ جب بغداد زوال کے نرغے میں آیا تو مشرق میں بخارا کی حکومت کا زور بڑھ گیا۔ بخارا کی حکومت کمزور پڑ گئی تو غزنی کا ستارہ چمکا۔ غزنی سے عجمی مسلمانوں کا مرکز لاہور میں منتقل ہوا، اور لاہور آگے چل کر دہلی کے مرکز کا پیش خیمہ بنا۔ اَب اگر اسلام کو محض عربی اقوام تک محدود کر دیا جائے اور عربوں کا عروج و زوال اسلام کے عروج و زوال کے مترادف سمجھ لیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے اہل علم کا دستور بن گیا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی یہ تمام محنتیں جو بغداد، بخارا، غزنی، قاہرہ اور دہلی کے

www.rahimia.org

مرکزوں کو با اقتدار اور شان دار بنانے میں صرف ہوئیں یہ سب بیکار تھیں اور یہ سارے کے سارے مرکز اسلامی اجتماع کے حق میں دنبل (پھوڑا) سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اسلام کی اساسی حکمت

ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ جب سے ہم نے اسلام کی اساسی حکمت کو بین الاقوامی قرار دیا ہے اور ہم قرآن عظیم کو انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت کا حامل سمجھتے ہیں۔ اس وقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو جماعت یا گروہ بھی قرآن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں ہو، خواہ وہ عربوں میں سے ہو یا عجم میں سے، وہ سب کے سب ایک ہی درجے پر سمجھے جائیں۔ چناں چہ اسی بنا پر ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد کو پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجے پر آجاتے ہیں۔ اور جس طرح ہم قریش میں کسی خاص خاندان کا امتیاز نہیں مانتے، اسی طرح ہم اسلامی ملت میں عربوں کی اِنفرادیت کے قائل نہیں اور ان کی قومی برتری یا شخصی بڑائی کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ بے شک عرب اسلام کی اجتماعی تحریک کے امام ہیں اور انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے اصولوں پر ایک اجتماع کی تشکیل کی۔ اس لحاظ سے وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے قیامت تک قرآن کی اجتماعی زندگی کا ایک نمونہ ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب عربوں کی مرکزی قوت کمزور ہوگئی اور ان کا اقتدار باقی نہ رہا۔ تو خدانخواستہ اسلام بھی ختم ہوگیا۔ ہمارے نزدیک امیر المؤمنین حضرت امیر معاویہؓ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملے کی جس قدر عزت اور قدر و منزلت ہے، سلطان محمود غزنوی کی کشور کشائیوں کی بھی ویسی ہی قدر کرتے ہیں۔

عجمی اقوام کا شاہی دور

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھا۔ اس دور میں زمامِ اقتدار کلیتاً غیر عرب مسلمان اقوام میں آگئی۔ اور خود عرب قوم اور ان کا ملک تک عثمانی ترکوں کے ماتحت ہوگیا۔ ان مسلمان اقوام پر ان کے "قومی" بادشاہ ہی حکومت کرتے تھے۔ یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندہ نہ تھے کہ ان کے عزل و نصب کا اختیار جمہور کو ہوتا ہے کہ یہ تلوار کے زور پر تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور جو ان میں سے صالح ہوتا وہ البتہ جمہور کی

مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئے اور آخر کار ''شاہیت'' اپنے محکوموں کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ بدقسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان ''بادشاہوں'' کو جو اَب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، مسند اقتدار سے الگ کر کے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور دنیائے اسلام قومی شاہی حکومتوں کے بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ!

یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہوکر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کر دیا، یا انھیں اپنی مرضی کے تابع بنالیا، لیکن مسلمان جمہور خوابِ غفلت میں پڑے سوئے رہے اور اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی کی گئی تو جابر بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بارآور ہونے نہ دیا۔

قومی جمہوری تحریکات کی تخم ریزی

حسن اتفاق دیکھیے کہ اس ''شاہیت'' کے آخری دور میں کم و بیش ایک ہی زمانہ میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں، جن کے مخاطب جمہور تھے۔ تحریکیں قومی اور جمہوری تھیں۔ ان کے بانیوں کے پیش نظر ساری دنیائے اسلام نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں اس تحریک نے ''تنظیمات'' کی شکل اختیار کی، عربوں میں محمد بن عبدالوھاب پیدا ہوئے، شمالی افریقا میں امیر عبدالقادر نے قوم کی زمام قیادت سنبھالی، مصر میں خدیو محمد علی اہل مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے۔ ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظّم کرنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ان تحریکوں کا آغاز ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو تقریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے، مشرقی ملکوں پر پل پڑے اور بجائے اس کے کہ وہاں قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمانی حکومتیں بنتیں، یورپ والے بیچ میں آگئے اور تمام دنیائے اسلام ان کی ستم گاریوں سے تہہ و بالا ہوگئی۔

1918ء سے اسلامی دنیا میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلامی ملکوں میں ایک صدی پہلے جن قومی جمہوری تحریکوں کا بیج بویا گیا تھا' گو یورپ کے سیلاب نے اسے برگ و بار لانے کا اس وقت موقع نہ دیا، لیکن وہ بیج اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہا، اور جونہی

www.rahimia.org

گزشتہ جنگ عظیم ختم ہوئی اور محکوم قوموں کو سر اُٹھانے کی فرصت ملی تو تقریباً ہر اسلامی ملک میں عوام نے آزادی کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے قومی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی، مصر میں سعد زغلول نے قومی پارلیمنٹ بنائی، شام، فلسطین، طرابلس، تیونس اور مراکش وغیرہ میں بھی قومی تحریکیں اُٹھیں، لیکن وہاں کے جمہور اپنی آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے، ہندوستانی مسلمان بعض مخصوص حالات کی بنا پر اپنے ملک کی قومی تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔

قومی جمہوری دور

دنیائے اسلام میں یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے۔ اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں، اور نہ کسی اسلامی ملک کے جمہور سے مطلق العنان بادشاہ کی جابرانہ حکومت ہی گوارا کرسکتے ہیں، جن مسلمان بادشاہوں نے رعایا کے خلاف مرضی، من مانی حکومت کرنی چاہی ان کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے اور جس مسلم قوم نے دوسری مسلم قوم پر زبردستی حکومت کرنے کی کوشش کی اس کا انجام گزشتہ جنگ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے معاملے میں واضح ہوچکا ہے۔ الغرض! اس دور میں ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ کسی نام سے بھی اپنے ملک میں دوسروں کی دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور نہ وہ دوسروں کے سر پر اپنی حکومت تھوپنے کا روادار ہے۔ چناں چہ ہر قوم اپنی زبان کو ترقی دے رہی ہے۔ افغان پشتو کی ترویج کررہے ہیں، ایران میں فارسی کو زندگی کے ہر شعبے میں لازمی بنادیا گیا ہے۔ عربی بولنے والی قومیں عربی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناچکی ہیں اور ترک تو زبان کے معاملہ میں کافی نام پیدا کرچکے ہیں، اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی حامل کوئی ایک قوم نہیں رہی ان چودہ سو برسوں میں اسلام کا دائرہ کافی وسیع ہوچکا ہے۔ اَب عربوں کے علاوہ اور قومیں بھی مسلمان ہوچکی ہیں۔ لہٰذا اَب اگر کبھی کوئی بین الاقوامی اسلامی ادارہ بنے گا تو اس میں ساری مسلمان قومیں برابر کی شریک ہوں گی یعنی ہر مسلمان قوم اور ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہوگا اور پھر یہ آزاد قومیں اور ممالک باہم مل جل کر کسی بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل کریں گے۔

الغرض اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ ان مختلف ادوار میں سے گزر

چکی ہے، حضرت عثمانؓ کی شہادت تک جب کہ ساری اُمت متفق و متحد رہی۔ اسلامی حکومت کا مثالی دور ہے۔ حضرت علیؓ کے دو برس عربی قومی حکومت اور ''السابقوں الاولون'' کی مثالی حکومت کی بیچ کی کڑی ہیں، امیر معاویہؓ سے مسلمان عربوں کی حکومت شروع ہوتی ہے اور خلیفہ ہارون رشید پر عربی سیادت کا دور ختم ہوجاتا ہے۔ مامون الرشید سے زوال بغداد تک عباسی خلافت کے زیر سایہ عجمی قومیں برسر اقتدار آتی ہیں۔ زوالِ بغدار سے عربیت کا کلی خاتمہ ہوجاتا ہے اور خالص ترکی دور شروع ہوتا ہے۔ 1918ء میں ترکی کی آخری نشانی یعنی عثمانی سلطنت کا چراغ سحر بجھ جاتا ہے اور یہاں سے قومی جمہوریتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

اسلامی بین الاقومیت کا مستقبل

ہمارا یہ دور قومی جمہوریتوں کا دور ہے، لیکن یہ قومی جمہوری رنگ اسلام کی بین الاقوامی روح کے خلاف نہیں۔ مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ پہلے تو وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد ہوں اور آگے چل کر یہ آزاد اکائیاں اپنی کوئی بڑی وحدت بنالیں، لیکن اس وقت تو مقدم یہ ہے کہ ہر ملک آزاد ہو، اسلامی بین الاقوامیت اس کے بعد کی چیز ہے۔ اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور ان کی وَجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے کہ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں، جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی یا مافوق قومی حکومت ہی ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے اور پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے بہ ظاہر اس کا کوئی اِمکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرض وجود میں آسکے۔ اگر ان کی یہ بات تسلیم کرلی جائے تو نعوذ باللہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سلطنت کے ان تیرہ سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا۔ اور اَب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں، اور جب اسلام کے نظام کی دیرپائی کا یہ عالم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متأثر ہوگی۔ اسلام اور ان کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں

اسلام کے ساتھ دشمنی کررہے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں، اگر ان دعاوی کو عملی نقطۂ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہ ان دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔

خودساختہ نظریہ سازوں کا موہوم تصور

اسلام کے اس طرح کے نظریہ ساز پہلے تو اسلام کے متعلق ایک موہوم تصور پیش کرتے ہیں اور جب اپنی گردوپیش کی زندگی اور ماضی کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے اس موہوم تصور کو عملی جامہ پہنتے نہیں دیکھتے تو پھر اپنی ایک خیالی دنیا بساتے ہیں۔ لوگوں کو اس دنیا میں آباد ہونے کی بڑی گرم جوشی سے دعوت دیتے ہیں اور چوں کہ اس کے لیے محض خیالی آفرینی شرط ہے اور ماحول سے چھیڑ چھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا' اس لیے عمل پر خیال کو ترجیح دینے والے ذوق وشوق سے ادھر متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہورہا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود تو کچھ نہیں کر پاتے اور نہ خیالی دنیا سے کبھی باہر قدم رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ عملی زندگی کی دشواریوں، رکاوٹوں اور آلائشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی قوم کو جس پستی میں وہ ہے، اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن حالات میں وہ قوم گھری ہوئی ہے۔ ان حالات کے مطابق قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک مردود اور گھٹیا انسان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو کہے اور کچھ نہ کرے وہ مجدد ملت اور جو کچھ کرنے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کام ہمیشہ گردوپیش کے حالات کو مدنظر رکھ کر ہی ہوسکتا ہے اور اس کے لیے بلندی سے نیچے اُترنا پڑتا ہے، وہ مردود ٹھہرے۔

www.rahimia.org

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا۔ یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی، لیکن اسلامی انقلاب سے جو شان دار اور دوررس نتائج برآمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی۔ اموی فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہوسکے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔ اس وقت ممالک فارس وروما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ ایک نیا سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لے کر اُٹھے اور تاریک دنیا میں علم کا نور پھیلا دے۔ مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور روم کے ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعرِ مذلت میں پھینک دیا تھا۔

بنوامیہ کی عربی حکومت نے ایک تو ممالک فارس وروم کے کھنڈرات صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ دوسرے فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو عام بھی کیا۔ اس طرح مفتوحہ ممالک کی قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر مجبور ہوگئے۔ موسیو لیبان کے الفاظ میں: ”خوں ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں دیا گیا تھا، از سرِ نو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے اُفق روشن ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت وجلال کے ایک شان دار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔“ (صفحہ نمبر 27، پمفلٹ ھذا)

www.rahnuma.org